© rasailojaraid.com

ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جس ذوق وشوق، محنت وجستجو اور ایثار واستقامت کے ساتھ ارشادات نبوی کو جمع ومحفوظ کیا اور اگلی نسلوں تک پہنچایا، وہ ان کی حوصلہ وعزیمت کا ایک مستقل اور روشن باب ہے جو بجائے خود علم وفضل کے متلاشیوں کے لیے مشعل راہ ہے اور احادیث نبویہ کے ایک بڑے ذخیرہ کو امت تک منتقل کرنے کے لیے ان کی یہ محنت جہاں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے، وہاں یقیناً حضرت ابوہریرہؓ کی کرامت بھی شمار ہوگی۔ حافظ محمد اقبال رنگونی نے اسی داستان عشق ومحبت کو دل چسپ پیرایے میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کا علمی جدوجہد کے مراحل ومظاہر کے بارے میں معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے اور استفادہ وافادہ کے باب میں حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق واسلوب سے اپنے قارئین کا آگاہ کرنے کے علاوہ ان پر کیے جانے والے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات بھی شامل کتاب کر دیے ہیں۔

حدیث وسنت کی اہمیت اور حجیت پر کام کرنے والے علماء کرام اور طلبہ کے لیے یہ کتاب بطور خاص استفادہ کی چیز ہے۔

یہ کتابیں ادارہ اشاعت الاسلام پوسٹ بکس ۳۶ مانچسٹر M167AN(UK) نے شائع کی ہیں اور پاکستان میں صدیقی ٹرسٹ المنظر اپارٹمنٹ ۴۵۸ گارڈن ایسٹ نزد بس بیلہ چوک کراچی ۷۴۸۰۰ سے طلب کی جا سکتی ہیں۔

(ابوعمار زاہد الراشدی)

”جماعت اسلامی پاکستان: ایک حاصل مطالعہ“

مولف: ثاقب اکبر

ناشران: البصیرہ، گلی نمبر ۲۹۹، جی نائن تھری، اسلام آباد

صفحات: ۱۵۲۔ قیمت: ڈیڑھ صد روپے

یہ ایک مختصر کتاب ہے۔ مولف نے خود اسے کتابچہ کہا ہے۔ مولف کے مطالعے کا واقعی حاصل ہے۔ مولف نے دیباچے کو ”پہلی بات“ کا عنوان دیا ہے۔ اس میں مولف نے لکھا ہے کہ ”اس تحریر میں اصولی اور اجمالی طور پر جماعت کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیگر مصروفیات اور وقت کی قلت بھی موضوع کو محدود رکھنے کی متقاضی تھی، لہٰذا زیر نظر کتابچے کو اسی پس منظر میں پڑھنے کی ضرورت ہے۔“ مولف کے مطابق اہم پہلوؤں کا ذکر اور موضوع کو محدود رکھنے کا تقاضا، دو متضاد سمتوں کو اختیار کرنے کا کام ہے۔ ہم اس کا لحاظ رکھ کر کتابچے کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

کتاب کی تالیف کا فوری محرک ایرانی انقلاب کا پس منظر ہے۔ جماعت کی قیادت کی جانب سے انقلاب کا خیر مقدم ہوا تو مولف نے جماعت پر لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ یہ شوق وجذب، انقلاب کی وہ مشترک خواہش ہے جو جماعتی حلقوں میں پون صدی سے پرورش پا رہی ہے اور ایران میں یہ انقلاب عملی صورت میں موثر ہوا۔ جماعتی حلقوں میں اس انقلاب کا مطالعہ بھی اسی جذبِ مشترک کے تحت ہوا۔ مولف نے اس مطالعے کے حوالے بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ کتاب میں سب سے زیادہ سیر حاصل بحث بھی اسی حوالے سے کی گئی ہے۔ یہ بحث کافی معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔ اس میں جماعتی قیادت کی انقلاب کے بارے میں مختلف مراحل میں بدلتی ہوئی روش کا بھی اچھا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ کتاب کا حاصل ہے۔ مولف نے خوب جم کر لکھا ہے۔ اس سے مولف کے ذہنی رجحان کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے بعض دیگر حصوں سے واضح ہوتا ہے کہ مولف نے کافی محنت اور جستجو سے کام لیا ہے۔ موصوف کا مطالعہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشاہدہ کافی وسیع ہے۔ مولانا مودودی اور بعض زعما سے ملاقاتوں کو بھی اپنے پیش کردہ نتائج کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود کتاب کا معیار صحافیانہ معیار سے کسی طرح اونچا نہیں۔ بعض پہلوؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف کا مطالعہ بہت سرسری، ناقص اور ادھورا ہے۔ موضوع کے پھیلاؤ نے اسے اور بھی اجمالی بنا دیا ہے۔ اس سے مدعا کی معنویت بھی کافی مجروح ہوئی ہے۔ زیادہ اچھا ہوتا کہ کسی ایک پہلو کو سیر حاصل مطالعے کے طور پر پیش کیا جاتا۔ موضوع کے پھیلاؤ کا اندازہ کرنے کے لیے فہرست مضامین جسے مولف نے ''اجمال مطالب'' کے عنوان کے تحت درج کیا ہے، دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک خاص بات جو مجھے بہت کھٹک رہی ہے، یہ ہے کہ حاصل مطالعہ تو جماعت کا پیش کیا جا رہا ہے مگر ساتھ ہی بانی جماعت کے عقائد اور افکار کو جماعت کے عقائد و افکار کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ جماعت کے عقائد، نصب العین اور مقاصد کی تفصیل جماعت کے دستور میں پوری شرح و بسط کے ساتھ درج کر دی گئی ہے۔ مولف نے کتاب میں اس کا بہت اچھا خلاصہ دیا ہے۔ مولانا مودودی کے عقائد اور افکار کو دستور جماعت کی سطح پر کسی طرح متعلقہ بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا مودودی نے اس بارے میں کئی بار خود بھی وضاحت کی ہے۔ اس طرح کتاب کے بنیادی عنوان سے بھی تجاوز ہوا ہے۔ اس لحاظ سے مولف نے جماعت کے بارے میں فرقہ واریت کا تاثر پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ اسی کا شاخسانہ نظر آتی ہے۔

کتابچے کے بعض حصے مولف کی معلومات کے ادھورے پن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۸ پر لکھا ہے کہ ''جماعت کی رکنیت کے تین درجے میں، متفق، امیدوار رکنیت اور رکن''۔ مولف سے یہ امر صرف نظر ہو گیا ہے کہ قاضی حسین احمد کے دورِ امارت میں ایک چوتھا درجہ ممبر کا بھی شامل کیا گیا۔ اس کو دستور اور تنظیم کا حصہ تو نہیں بنایا گیا تھا مگر اس کے لیے بڑی مہمات چلائی گئیں اور ان کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ اس سب کچھ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ جماعت کو عوامی بنانے کا یہ اجتہاد قاضی صاحب کے ذہن کی اختراع تھا۔ اسے بعد میں، قاضی صاحب کے دور میں بھی اہمیت نہیں دی گئی۔ وقتی ہونے کے باوجود یہ پیش رفت اہم رہے گی۔ اس موقع پر تو یہ استدلال بھی کیا گیا کہ ممبر ہونے کے لیے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں۔

مولف نے صفحہ ۱۸ پر لکھا ہے کہ ''رکن جماعت کے لیے علم و عمل کی انتہائی سخت شرائط جماعت کے دستور میں درج کی گئی ہیں۔ مثلاً دستور کے مطابق وہ فرائض شرعی کا پابند ہو، دین کے بارے میں ضروری علم رکھتا ہو جماعت کے عقیدے کو اس کی تشریح کے ساتھ قبول کرے، جماعت کے نظم کی پابندی کا عہد کرے اور کسی ایسے ادارے کا رکن نہ ہو جو جماعت کے عقیدے سے مختلف عقیدہ رکھتا ہو۔'' ایسی شرائط کو انتہائی سخت قرار دینا ہجوم اور جماعت کے فرق کو نظر انداز کیے بغیر ممکن نہیں۔ اعلیٰ مقاصد کی جانب جد و جہد کے لیے انتہائی مضبوط اور مستحکم تنظیم لازم ہے۔ تنظیم کے لیے شرائط جتنی سخت ہوں گی، اتنی ہی وہ مضبوط ہو گی۔ جماعت میں رکنیت کی شرائط کم سے کم ہیں۔ تنظیمی استحکام کے لیے ان شرائط کو اور بھی سخت ہونا چاہیے تھا۔ تنظیمی قوت کا راز تعداد پر نہیں، ذہنی صلاحیت اور معیار کردار پر ہے۔ تحریکوں اور انقلابوں کی تاریخ میں کبھی کثرتِ تعداد کی بنا پر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ انسانی ذہن خدا کے بعد سب سے بڑی قوت ہے۔ اگر اسے بروئے کار لایا جائے تو قلیل سے قلیل تعداد کی مدد سے بڑے سے بڑے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ بہر صورت اس پہلو سے مولف کا نقطہ نظر گہرائی سے خالی معلوم ہوتا ہے۔ یہ شرائط رکنیت پر روایتی اعتراض ہے جو مولف نے شاید رواروی میں دہرا دیا ہے۔

مولف نے صفحہ نمبر ۲۳، ۲۴ پر جماعت کے عقائد کے بارے میں لکھا ہے کہ جماعت کے عقائد و افکار برصغیر کے فرقہ وارانہ ماحول کے پیش نظر مرتب کیے گئے ہیں۔ اس میں بریلوی اور اہل تشیع کے لیے کچھ کشش نہیں۔ وہ جماعت کے قریب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کم ہی آئے ہیں۔ جماعت دیوبندی مکتب فکر کی ایک شاخ سمجھی جاتی ہے۔مولف کا یہ قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ جماعت نے فرقہ وارانہ بنیادوں سے بلند ہوکر اپنے عقیدے اور نصب العین کو پیش کیا ہے۔جس نے بھی فرقہ وارانہ تصورات سے بلند ہوکر جماعت کے عقیدے کو قبول کیا، وہ جماعت میں شامل ہوا۔شمولیت کے بعد، اس کی اپنے مسلک سے وابستگی ذیلی نوعیت کی ہوگئی۔ جماعت میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر وابستگی کا کوئی سروے نہیں ہوا۔اہل حدیث مسلک سے وابستہ لوگوں کی خاصی تعداد جماعت میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔گوجرانوالہ میں تو جماعت کی اولین پناہ ہی مولانا محمد عبداللہ مرحوم کی مسجد دال بازار تھی۔مولانا مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر رہ چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مقامی سطح پر سیاسی اختلافات کی وجہ سے مولانا عبداللہ جماعت سے نالاں ہوئے تو دور ہی ہوتے گئے۔اہل تشیع اور بریلوی مکتب کے نمایاں لوگوں میں سے تو یقیناً جماعت سے کوئی وابستہ نہ ہوا۔کسی مسلک کے نمایاں لوگ کم ہی کبھی متاثر ہوکر کسی تنظیم کا جزو بنتے ہیں۔ عام لوگوں میں سے اہل تشیع کی مثالیں کافی موجود ہیں۔ بریلوی مکتب سے متعلقہ لوگوں کی بھی کافی تعداد جماعت میں موجود ہے۔ان میں سے نمایاں خود پروفیسر غفور احمد کی مثال تو خوب معلوم ومعروف ہے۔

مولف نے صفحہ نمبر ۱۰۹ پر قاضی حسین احمد کے ذکر میں لکھا کہ وہ قیم جماعت منتخب ہوئے، حالانکہ قیم جماعت کا انتخاب نہیں، تقرر ہوتا ہے۔ جماعت کے دستور اور تنظیمی ڈھانچہ کا اگر مولف نے بغور جائزہ لیا ہوتا تو یہ آسانی سے واضح ہوجاتا کہ جماعت کا تمام تر نظم نامزدگیوں پر مبنی ہے۔امیر جماعت کا ارکان براہ راست انتخاب کرتے ہیں۔ بقایا جملہ امرا کا عزل و نصب بالائی نظم کی صوابدید پر ہے۔استصواب کا ذکر موجود ہے مگر استصواب کی عملی اہمیت برائے نام رہ گئی ہے۔البتہ شوریٰ ہر سطح پر منتخب کی جاتی ہے۔لیکن اگر جماعت کے پورے نظام قیادت وشوریٰ کا اعداد وشمار اور ریکارڈ کی رو سے جائزہ لیا جائے تو اس نظام کا انتخابی پہلو محض نمائشی ہے۔ یہ نظام تسلسل وتواتر پر مبنی ہے۔امیدواری اور کنونسنگ کے بغیر کوئی انتخاب انتخابی نہیں ہوسکتا۔ بہرحال یہ ایک مستقل موضوع ہے۔

مولف نے صفحہ ۶۳ پر پروفیسر غفور احمد اور قاضی حسین احمد کے بارے میں تحریر کیا کہ انتخابی مہم میں انہوں نے پیپلز پارٹی کے خلاف اشتعال انگیز، جارحانہ اور بعض اوقات غیر شائستہ زبان استعمال کی۔ میرے نزدیک ان کا یہ لکھنا بالکل بے جا ہے۔ ہر دو عمائدین جماعت کے بارے میں اس طرح بات کہنا غلط ہے۔اس کی شہادت پیش نہیں کی جاسکتی۔مولف کا یہ لکھ دینا ناقابل فہم ہے۔کتاب میں ایک آدھ مقام پر طلبہ اور ذیلی تنظیموں کے حوالے سے غیر معیاری طرز عمل کے حوالے سے مولف نے بہت کچھ لکھا ہے۔مگر یہ سب کچھ نہیں۔

کتاب میں جماعتی لٹریچر کے حوالے موجود ہیں، مگر جماعت کی دو جلدوں پر مشتمل تاریخ مرتبہ آباد شاہ پوری کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولف اس کتاب سے شناسا نہیں۔ آباد شاہ پوری نے جس بھرپور انداز سے جماعت کی تاریخ کو پیش کیا ہے، وہ حرفِ آخر ہوتی اگر اس کی تکمیل ہوجاتی۔ دونوں ضخیم جلدیں ۱۹۴۷ء تک پہنچتی ہیں۔اس کی ترتیب کا اہتمام جماعتی ادارے معارف اسلامی نے کیا ہے۔ مابعد جماعت کے دور کو مرتب کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ معلوم نہیں جماعت کے اندر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا نہیں۔ علاوہ ازیں کتاب میں تنقیدی رجحان خاص قوی ہے۔اس کے لیے تازہ او مستند ترین مواد میاں طفیل محمد کا طفیل نامہ ہے۔اسے پروفیسر وقار احمد نے ترتیب دیا اور میاں طفیل صاحب نے اس پر نظر ثانی کی۔ فیصل بک سیلرز اردو بازار لاہور سے مل جاتی ہے۔مولف کی نظر سے یہ کتاب بھی شاید نہیں گزری۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولف کی نظر اس پہلو پر نہیں گئی کہ اگر سید مودودی جماعت میں مجتمع دینی ٹیلنٹ کو ساتھ رکھ کر اپنی جدو جہد کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو جاتے اور ایسی حکمت عملی مرتب کرتے جو اقتدار میں جلد آنے کے شوق میں تنہا پرواز کے بجائے ساتھیوں کے ساتھ زمینی حقائق کے شعور اور ادراک پر مبنی ہوتی تو نہ جماعت اپنا کردار اور ساکھ برباد کرتی اور نہ ہی منزل کھوٹی ہوتی۔ یقینی طور پر جماعت اپنی منزل پا لیتی۔ یہ جماعت سید مودودی کا شاہکار ہے۔ یہ شاہکار، کامل شاہکار بن جاتا۔ اس سلسلے میں امیر جماعت کے طور پر ساتھیوں کے بچھڑنے کی ذمہ داری سید مودودی پر ہی عائد ہو گی۔ اس میں قصوروار کون تھا اور کون نہیں تھا، اس کا فیصلہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ البتہ تاسیس جماعت کے بعد ابتدائی دو تین سال میں جماعت چھوڑنے والے اکابرین جماعت اور ذمہ داران جماعت کی خط و کتابت سے اختلافات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ان اختلافات کی بنا پر جماعت چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہاں اس خط و کتابت میں ذمہ داران جماعت بشمول سید مودودی کے انداز کلام سے مایوسی ضرور ہوتی ہے۔ خطوط کے جواب میں ذمہ داران کا لہجہ بے نیازی، گریز اور فرار کا رہا۔ یہ رویہ مخاطب کے لیے اشتعال کا باعث ہو سکتا ہے۔ سید مودودی نے یہ محسوس نہ کیا کہ اگر تاسیس کے وقت اتفاق رائے سے منزل تک کا عہد سفر کرنے والے ان کے برابر کے لوگ ساتھ نہ رہے، وہ ان کو چھوڑ گئے تو منزل کھوٹی ہو گی، تحریک کبھی راہ پر محو سفر نہ رہے گی۔ چنانچہ بعد میں دوسری صف کے لوگوں کے ہاتھ میں قیادت آئی تو ان کی ترجیحات بدل گئیں۔ آج کی قیادت، ہر سطح پر تحریک کے مقاصد کو ثانوی ترجیح میں رکھے ہوئے ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ معاشی مقاصد پورے ہو رہے ہیں اور تحریک اپنے حقیقی مقاصد سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

دراصل سید مودودی کے ذہن میں شروع ہی سے جو مقاصد تھے، تاسیس کے وقت ایک سمجھوتے کے تحت ان کو موخر کر کے سفر شروع کیا گیا۔ سید مودودی کا تنہا پرواز کا شوق وقتی طور پر ترک کیا گیا۔ یہ سمجھوتہ کبھی باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک چیز سید مودودی نے میزبان اور موسس کے طور منوالی کہ وہ پانچ سال کے لیے امیر منتخب ہوئے۔ بار بار کے انتخاب پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس طرح نظام انتخاب بھی ایسا رہا کہ متبادل قیادت رائے دہندگان کی نظر سے اوجھل رہے۔ اوپر کی ٹیم میں برابری کی سطح کے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہو لیکن اعلیٰ ترین مناصب پر بدل بدل کر، ہر ایک کے لیے اپنی متنوع صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع فراہم نہ کیے جائیں تو تنہا پرواز کے شوق کو پورے کرنے کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں اور ساتھی ساتھ چھوڑ ہی جایا کرتے ہیں۔ تنظیم بھی متنوع سمتوں میں سفر کے بجائے ایک ہی مزاج اور سمت کی آئینہ دار بن کر ادھورے پن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس میں اجتماعی فکر کے بجائے ایک شخصیت کا پرتو غالب آ جاتا ہے۔ یہی کچھ ہوا اور جماعت موجودہ پوزیشن پر پہنچ گئی۔ ایک بار یہی سوال میں نے جناب جاوید غامدی سے کیا تو انہوں نے کہا کہ جماعت کے نظام میں اتنا حبس تھا کہ کسی ذہین آدمی کے لیے کھپ جانے کا کوئی موقع ہی نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ایک عرصہ تک جماعت میں ساتھ رہے، وہ بھی مولانا مودودی کے حسن طبع کی وجہ سے رہے۔ جماعت کے نظام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مولف کتاب نے اس پہلو پر بالکل توجہ نہیں دی، حالانکہ یہ پہلو سب سے اہم معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال کتاب کے بارے میں، میں نے جن تحفظات کا اظہار کیا ہے اس کے باوجود کتاب خاصی دلچسپ اور متوازن پیرایہ بیان رکھتی ہے۔ کافی معلومات افزا ہے۔ آزاد ذہن کے ساتھ پڑھنے والے کو اس میں کافی کچھ پڑھنے کو مل سکتا ہے۔

(چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ)

© rasailojaraid.com